۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

REGD. NO. L. 942
R.No. 2186/57

ہفتہ وار

ہماری زبان

ایڈیٹر: آل احمد سرور

اس شمارے میں

آل احمد سرور

ہر چیز کی قیمت ادا کیجئے

ہم ہندوستانیوں کے متعلق کسی مبصر نے بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔ یہ لوگ بغیر کچھ دیئے بہت کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں (SOMETHING FOR NOTHING) اس بات میں مبالغہ ہو سکتا ہے مگر کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ اردو دوستوں پر تو بڑی حد تک یہ بات صادق آتی ہے۔ عام طور پر اردو دوست سمجھتے ہیں کہ حکومت، اکثریت، سیاسی پارٹیوں، لیڈروں پر سب کچھ فرض ہے ان کو انفرادی طور پر کچھ نہیں کرنا ہے۔ اردو کے ادیب چاہتے ہیں کہ ان کی کتابیں خوب بکیں، مگر وہ خود بہت کم کتابیں خریدتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے کتاب رائے کے لئے بھیجی جائے اور وہ رائے دے یا نہ دے ناشر اور دوسرے ادیب اسے کتابیں بھیجتے رہیں۔ وہ لوگ جو سرکاری افسر ہیں یا تاجر ہیں اردو کے ادیبوں کے سامنے اردو سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور اس دلچسپی کی وجہ سے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ انھیں کتابیں یا رسالے پڑھنے کے لئے دیئے جائیں۔ اردو کا دانشور طبقہ زیادہ تر انگریزی اخبار خریدتا ہے، اردو اخبار، مانگ کر پڑھ لیتا ہے۔ اردو کے بہت سے ادیبوں، معلموں اور ناشروں کو ہم جانتے ہیں جن کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور وہ یہ بتاتے ہوئے بالکل شرم محسوس نہیں کرتے کہ ان کے بچے یا تو بالکل اردو نہیں جانتے یا برائے نام جانتے ہیں۔ بیشتر والدین حکومت یا اکثریت کی اردو دشمنی کا رونا روتے ہیں مگر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اردو کم سے کم ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائیے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ انجینیرنگ کے لئے اسے تیار کر رہے ہیں یا ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی اونچی اڑانوں میں غریب اردو کا کیا ذکر۔ ایسے لوگوں کو بھی ہم جانتے ہیں جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اردو کے لئے بھوک ہڑتال اور جان کی قربانی کی بات کرتے ہیں مگر اس خیال سے سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کے انتظام کرنے کے لئے درخواست نہیں دیتے کہ اس سے پرنسپل یا استاد لڑکے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ آج کی بحث میں چند بنیادی حقائق کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ ہماری زبان کے پڑھنے والے اس پر سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

اگر اردو ہماری زبان ہے، اگر اس میں ہماری تہذیب، ہماری تاریخ، ہماری امنگوں اور آرزوؤں، ہماری ذہنی شخصیت اور ہمارے جمالیاتی، اخلاقی، سماجی اقدار کی کہانی درج ہے، اگر اس کے ذریعے سے ہم خیال کی بلندی، جذبے کی گہرائی، احساس کی نزاکت، روح کی پرواز، شعور کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں تو پھر اس کی بقا اور ترقی ہم پر فردی حیثیت سے کس حد تک فرض ہے اور ہم یہ فرض کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اردو زبان ہمارے گھر کی لونڈی ہے جس کا کام رات دن ہماری خدمت کرنا ہے اور جس کے لئے ہمیں صرف روٹی کپڑا جیسا کرنا ہے تو دوسری بات ہے، لیکن اگر اس زبان کا تعلق ہماری سیرت و شخصیت کی تعمیر سے گہرا ہے اور اگر اس کے بغیر ہم اپنی صلاحیتوں کی تکمیل نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں اس کی بقا اور ترقی کے لئے خود کچھ کرنا پڑے گا۔ خود کچھ کرنے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم زندگی کے سارے کاروبار چھوڑ کر اردو کی بقا اور ترقی کے لئے جدوجہد شروع کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے اوپر یہ لازم کر لیں کہ جس طرح ہم اپنا کچھ وقت اور کچھ توجہ اور کچھ روپیہ زندگی کے دوسرے کاموں پر صرف کرتے ہیں اسی طرح اس کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو پر بھی صرف کریں۔ پھر اس صرف کے بھی کئی طریقے ہیں۔ ہم اردو کے اداروں کے کاموں میں مدد کے لئے کچھ وقت نکال سکتے ہیں۔ ہاں ہم اپنی دلچسپی اور صلاحیت کے اعتبار سے اداروں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے بجٹ کا کچھ حصہ اپنے مقدور کے مطابق اردو کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی خریداری پر صرف کریں۔ پھر ہم اس بات کو لازم کر لیں کہ ہم اپنے بچوں کو ہر حال میں اردو پڑھائیں گے اور اس کے لئے پہلے تو جو سہولتیں حکومت کی طرف سے دی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور اگر کسی وجہ سے نہیں ہو سکتا تو دوسرے اردو دوستوں کے ساتھ مل کر اردو کے اسکول اپنے علاقے میں چلائیں گے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو خود کچھ وقت نکال کر اپنے بچوں کو نہ صرف اردو پڑھائیں گے بلکہ انھیں اردو پر فخر کرنا

سمجھا ئیں گے یعنی اگر ہمیں اردو سے محبت کا دعویٰ ہے تو ہمیں اس محبت کی قیمت ادا کرنا چاہئے۔ خالی خولی محبت کا اظہار بے معنی ہے۔

ہمارے یہاں عشق کا بھی عجیب تصور ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہوگیا تو وہ کہتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسے اب کچھ نہیں کرنا ہے۔ اگر محبوب اس کے عشق کو جواب عشق سے نہیں دیتا تو وہ ظالم اور سفاک ہے۔ وہ اپنے حسن کے نشے میں سرشار ہے وہ خالص محبت کی قدر نہیں کرتا بلکہ مال و دولت کی قدر کرتا ہے۔ عشق کا یہ رومانی بلکہ مریضانہ تصور زبان و ادب کے سلسلے میں بھی نظر آتا ہے۔ اگر ہم کو اردو زبان سے محبت ہے، اگر ہم انگریزی جیسی شاندار زبان یا موجودہ حالات میں کام آنے والی سرکاری زبان کے ہوتے ہوئے اردو جیسی غیر نفع بخش زبان کی بات کرتے ہیں، اس کی ترقی کی خواہش کرتے ہیں، اس کی حمایت میں تقریریں کرتے ہیں تو یہ کیا کم ہے۔ ہمیں زندگی میں کامیاب ہونا ہے۔ ہمیں سماجی مرتبے کی اگلی سیڑھی پر چڑھنا ہے اس لئے اردو کے لئے عملی طور پر کچھ کرنا یا اس پر روپیہ خرچ کرنا کیا ضرور!

خدا بخشے اکبر الہ آبادی کو انھوں نے مسلمانوں کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا۔ یہ شعر اردو دوستوں پر بھی صادق آتا ہے۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفا مرا با حسرت و یاس

پروفیسر آل احمد سرور کی امریکہ کو روانگی

ادبی اور علمی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر آل احمد سرور شکاگو یونیورسٹی میں جنوبی ہند کی زبانوں کے مرکز میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یکم اکتوبر ۶۹ء سے ۱۳ر مارچ ۱۹۷۰ء تک درس دیں گے اور سیمینار لیں گے۔ آپ اردو ادب، غالب اور اقبال پر لکچر دیں گے۔ اس کے علاوہ پروفیسر سرور امریکہ کی بعض دوسری یونیورسٹیوں میں بھی خصوصی لکچر دیں گے۔

شعبہ کی کتاب جدیدیت اور ادب شائع ہوگئی

شعبۂ اردو کے زیر اہتمام جدیدیت اور ادب کے عنوان سے جو سیمینار ہوا اس کے تمام مضامین کو "جدیدیت اور ادب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے عنوانات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۲۸۸ صفحات کی یہ کتاب چھ روپے میں ڈائرکٹر یونیورسٹی پبلیکیشنز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا صدر شعبۂ اردو سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

علاقائی زبانیں ذریعۂ تعلیم ہوں

ونوبا بھاوے کی تقریر

کٹک، اڑیسہ کے ایک گاؤں میں تقریر کرتے ہوئے اچاریہ ونوبا بھاوے نے ذریعۂ تعلیم، استاد اور شاگرد کے رشتہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جانا چاہیے۔ طلبہ کی ذہنی نشوونما کے لئے یہ عمل ناگزیر ہے اور اسی طرح ان کی فکری اور ذہنی صلاحیتیں صحیح خطوط پر زیادہ بہتری کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہیں۔

● الجمعیۃ

برطانیہ میں انگریزی لب و لہجہ کی تربیت

لندن: غیر ملکیوں کے لئے برطانیہ کے چھ کالجوں میں خاص قسم کے تربیتی کورس شروع کئے گئے ہیں۔ جن میں ہندوستان اور پاکستان کے مستند اساتذہ داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کورسوں میں نشستوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔

ان کورسوں میں غیر ملکیوں کی بول چال کی انگریزی کو سدھارا جائے گا اور انھیں انگریزی اسکولوں کے طریقۂ تعلیم سے آگاہ کیا جائے گا۔ جو امیدوار کامیابی کے ساتھ کورس مکمل کر لیں گے انھیں اساتذہ کی جگہوں پر مامور کیا جائے گا۔ ● قومی آواز

شمالی ہند میں اردو مثنوی

علمی اور ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ڈاکٹر گیان چند جین کا تحقیقی مقالہ "شمالی ہند میں اردو مثنوی" منظر عام پر آ گیا ہے۔ یہ کتاب مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں

مرثیہ کی تحقیق کے چند پہلو

محقق کو رابنسن کروسو کہہ کر ایک مصنف نے اس کے بہت سے خصوصیات کا احاطہ کر لیا ہے۔ شواہد و آثار سے نئے نتیجے نکالنا، کیاب ماخذوں سے نئے واقعات سامنے لانا، حالات کو صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھ کر معلومات میں اضافہ کرنا محقق کا فریضہ ہے جس کی مدد سے ہمارا علم دیقین وسعت سے آشنا اور صحت سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ لیکن رابنسن کروسو کا استعارہ مرثیے کی تحقیق پر جس طرح صادق آتا ہے، شاید ہی کسی دوسری صنف پر ہو۔ اس لئے کہ اردو مرثیے کی نوعیت بڑی حد تک ایک خودرو جنگل کی سی ہے جس کی وسعت و پہنائی کا اندازہ طائرانہ نظر سے تو کر لیا گیا ہے لیکن قریب جانے کی بہت کم لوگوں نے کی ہے۔ قد آور درختوں کے پھول پتوں پر نگاہیں رک گئیں اور پوری سرزمین ایسے محنت کشوں کی منتظر ہے جو اس کا جائزہ لے کر نشیب و فراز کا اندازہ لگائیں، سبزیوں کی نشان دہی کریں اور ارتقائی تسلسل کے وہ خطوط واضح کریں جو کسی صنف ادب کو سماجی عوامل کی گود میں ترقی و زوال سے ہمکنار کرتے ہیں۔

جہاں تک قدیم دکنی مرثیوں کا تعلق ہے ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی وغیرہ نے بڑی دیدہ ریزی اور جانسوزی سے ادوار کا تعین کیا اور اہم مرثیہ گویوں کے زمانۂ حیات مقرر کر کے تاریخی تسلسل سے ان کے کلام کے نمونے پیش کئے اس سے وہاں کی مرثیہ گوئی کا ایک عام ڈھانچہ ادبی مورخ کے سامنے آ گیا۔ لیکن شمالی ہندوستان جہاں یہ صنف اپنی معراج کو پہنچی عدم توجہی کا وہ جزیرہ ہے جسے ایک کیا کئی رابنسن کروسوؤں کی ضرورت ہے جو مرثیہ کی ہیئت اور مواد کا جائزہ لیں اور ان کے ارتقائی رجحانات کو نظر میں رکھ کر ادوار کی تقسیم کریں۔ دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ بنگال، بہار اور مدھیہ پردیش وغیرہ میں بھی اس صنف کی متوازی ترقی کو سامنے رکھنا ضروری ہے تاکہ دو سو برس کی ادبی روایت کے خدوخال نمایاں ہوں اور مرثیے پر تحقیق کام کرنے والوں کو یہ معلوم ہو کہ اس کے سفر کا نقطۂ آغاز کہاں ہونا چاہئے۔

مرثیہ کی تحقیق میں سب سے اہم مسئلہ میرے لئے یہ تھا کہ مرثیوں کا جو وسیع ذخیرہ جگہ جگہ موجود ہے ان میں کثیر تعداد ایسی ہے جن کے مصنفوں کے نام کسی تذکرے میں ہیں نہ تاریخ میں۔ ان میں سے کن مرثیہ گویوں کو نمایاں قرار دیا جائے اور کن کو چھوڑ دیا جائے۔ پھر ان نمایاں لوگوں میں ادوار کی تقسیم کس طرح ہو۔ اس سلسلے میں مرثیہ گو کے زمانے کا تعین بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ ایک دور کا معمولی مرثیہ گو اگر اس سے پہلے کے دور میں رکھ دیا جائے تو بہت اہم ہو جائے گا۔

دور قائم کرنے اور تاریخی تسلسل کی رفتار متعین کرنے میں شعرا کے زمانہ پیدائش و وفات اور ان کے ادبی ماحول کا علم ضروری ہے۔ تذکروں میں ایک تو بہت کم مرثیہ گویوں کے نام ملتے ہیں لیکن جو معدودے چند ایسے خوش قسمت ہیں بھی ان کے بارے میں اسی قدر سرسری اندراجات ہیں کہ ان سے ان کے زمانے کا تعین کرنا آسان نہیں۔ اس لئے شعرا کے کلیات میں قطعات تاریخ کبھی رہنمائی کرتے ہیں، کبھی کوئی اور معاصرانہ تحریر۔ بیسیوں دیوان دیکھئے، ہفتوں ورق الٹنے کے بعد ایک قطعہ تاریخ بھی مل جائے تو مہینوں اور برسوں کی محنت کا انعام مل جاتا ہے۔ لیکن میری ورق گردانیاں اور صفحہ نوردیاں اس سلسلے میں کامیابی سے کم دوچار ہوتی ہیں۔

اس نے دور قائم کرنے کے لئے کچھ لسانی خصوصیات، کچھ ساخت اور کچھ طرز اظہار کو مدنظر رکھ کر مرثیے پڑھے گئے اور انھیں الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ان حصوں میں جو مرثیے اور مرثیہ گو بہتر اور نمایاں معلوم ہوئے انھیں اس دور کا نمائندہ قرار دے کر کوشش کی گئی کہ قرائن اور شواہد سے ان کے زمانے کی تصدیق کی جائے اور کامیابی کی صورت میں انھیں اس دور میں قطعی طور پر رکھ دیا جائے۔

اس طریق کار میں غلطی کے امکانات ہیں۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی اچھے مرثیہ گو کا صرف ایک یا دو مرثیے اور وہ بھی اس کا بہت کمزور مرثیہ ہو جس کی بنا پر اسے اپنے دور کی نمائندگی سے خارج کر دیا جائے۔ یا کسی مرثیہ گو کے ابتدائی زمانے کا کلام ہی ملے اور اسی بنا پر اسے اپنے پہلے والے دور میں رکھ دیا جائے حالانکہ اس کی مرثیہ گوئی کا عروج بعد کے دور میں ہوا ہو۔ ایسے امکانات کی تفصیل میں جانا اس وقت بیکار ہے۔ بہر حال محقق کا کام موجود مواد اور دسترس کے اندر شواہد اور ماخذ کو ملحوظ رکھ کر دیانت اور سنجیدگی سے تاریک گوشوں کو روشن کرنا اور نامعلوم باتوں کی طرف نشان دہی کرنا ہے۔ اسے یہ کام پورا کر کے اصلاح و ترقی کے لئے مستقبل کے حوالے کر دینا چاہئے۔

ان باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مرثیے کی تاریخ مرتب کرنے اور اس کے ارتقا پر کام کرنے کے لئے مرثیوں کے متن کی کتنی اہمیت ہے۔ ادوار کا تعین مرثیہ گویوں کے خصوصیات، مرثیہ کی ہیئت، موضوعات، موضوع اور طرز بیان

اعجاز اختر

غزل

ابھی تمام آئینوں میں ذرہ ذرہ آب ہے
یہ کس نے تم سے کہہ دیا کہ زندگی خراب ہے

نہ جانے ہم پہ آج پیاس کا یہ کیسا قہر ہے
کہ جس طرف بھی دیکھئے سراب ہی سراب ہے

کبھی نہ دل کے ساگروں میں تم اتر سکے مگر
مرے لئے مرا وجود اک کھلی کتاب ہے

ہر ایک راہ میں مٹے مٹے نقوش آرزو
ہر اک طرف تھکی تھکی سی رہگذار خواب ہے

کے سمجھنے اور سمجھانے کا دارو مدار انھیں پر ہے اس لئے ہماری پہلی کوشش یہ ہونا چاہئے کہ شمالی ہند کے قدیم مرثیے صحت کے ساتھ منظر عام پر لائے جائیں تاکہ ہمارا ادبی مورخ قیاسات و مفروضات کی اس بھول بھلیاں سے باہر نکلے جن میں وہ اس وقت گرفتار ہے۔ ان مرثیوں تک رسائی ہمارے ناقدین اور مورخین کو نہ صرف ادب کا صحیح رتبہ شناس بنائے گی بلکہ ان تحقیقی کام کرنے والوں کا راستہ ہموار کرے گی جو ابھی مرثیوں کی تلاش میں برسوں سرگرداں رہنے کے بعد ہی ان کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان متنوں کی فراہمی سے ان کا تحقیقی ذوق اور ادبی انہماک نئے راستوں پر لگے گا، وہ ویرانوں میں پھول کھلائیں گے اور پہاڑوں سے جوئے شیر نکالیں گے۔

لکھنؤ کے بڑے مرثیہ گویوں میں خلیق کے مرثیے ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ فصیح کے مرثیے شائع ہوچکنے کے باوجود اسی صف میں داخل ہیں۔ اس سے پہلے کے مرثیہ گویوں میں افسردہ اور احسان اور ان سے بھی پہلے کے گدا، سکندر اور حیدر کے کلام کا کیا ذکر ان کے نام سے بھی کم لوگ واقف ہوں گے۔ دہلی کے اہم مرثیہ نگاروں میں یہی حال سلام، کرم علی، محب، مسکین، ہوشدار وغیرہ کا ہے۔ انیس، دبیر، ضمیر کے ان پیش رووں سے ناواقفیت، ان کے حالات سے دوری، ہمارے محققین کے لئے ایک چیلنج ہے جس کا سامنا کرنے کے لئے پہلا قدم ان کے کلام کی اشاعت ہے۔

قدیم مرثیہ نگاروں سے ہٹ کر جب ان لوگوں کی طرف آیئے جن کا کلام شائع ہوچکا ہے تو نئی دشواریاں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر انیس یا دبیر کو لیجئے جن کی متعدد جلدیں اور مختلف ایڈیشن موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے حالات پر بھی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ تقریباً ان سب میں عقیدت و احترام، جانب داری اور عصبیت نے مصنفوں کو نہ صرف صحیح نتائج تک پہنچنے سے معذور رکھا ہے بلکہ اپنے ہیرو کی وکالت میں دوسروں کو گمراہ کرنے کی بات بھی مائل کیا ہے۔ وضاحت کے لئے صرف ایک مثال دوں گا۔

افضل حسین ثابت جو دبیر کے خاص شاگرد اور سوانح نگار ہیں دربار حسین میں میر ضمیر کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے اور جب آصف الدولہ نے دار الخلافہ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ اسے تاریخی لحاظ سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ میر ضمیر ۱۷۷۵ء میں لکھنؤ آکر مقیم ہوئے۔ اسی کتاب میں تھوڑی دور بعد یہ واقعہ درج ہے کہ انیس کے بچپن میں ان کے والد خلیق انھیں ضمیر کے پاس فیض آباد میں لے گئے اور مشورۂ سخن کے لئے ان کے حوالے کیا۔ اس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ ضمیر انیس کے بھی استاد تھے۔ اس دوسرے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ضمیر تقریباً ۱۸۱۰ء تک فیض آباد میں مقیم رہے۔ تاریخوں پر غور کئے بغیر ثابت نے ضمیر کے قیام فیض آباد کی مدت میں تقریباً ۳۵ سال کا اضافہ کر دیا ہے اور داستان سرائی کی عادت سے نہ صرف اپنے پہلے بیان کی تکذیب کی ہے بلکہ غلط فہمی کے ایسے پہلو پیدا کر دئے ہیں جن میں بعض لوگ گرفتار بھی ہوگئے ہیں۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ ضمیر نے اپنے بعض حالات اپنی مثنوی مظہر العجائب میں نظم کئے ہیں اور ضمیر کے استاد مصحفی نے ان کا ذکر اپنے تذکرے ریاض الفصحا میں کر دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دربار حسین کی یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں۔ لیکن ہمیشہ تو احتساب کے ایسے موقعے نہیں ملتے۔ مگر اس کے باوجود بھی ریاض الفصحا اور مظہر العجائب کی ایسی مستند اور معاصرانہ شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی لوگ دربار حسین کے بیان سے بھٹک گئے ہیں۔

غرض تاریخوں کا تعین اور غیر ذمہ دار لکھنے والوں کے بیانات کا احتساب دونوں سخت مرحلے ہیں جن میں ان لکھنے والوں سے بھی زیادہ مدد نہیں ملتی اس لئے کہ یہ بیشتر کتابیں یادداشت کے انداز میں لکھی گئی ہیں اور تاریخیں یا سنہ درج کرنے کا بالکل التزام نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے کی اور مثالیں دے کر آپ کا مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ بہر حال ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کرنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ایک نیک شگون ہے۔ مرثیہ کا میدان ابھی اپنی وسعت و پہنائی کے ساتھ ان ہمت والوں کا منتظر ہے جو سنجیدگی اور جانسوزی سے انجان علاقوں میں گھسیں اور علم کی سرحدوں کو وسیع کریں۔

●

بقایا صفحہ ۲ سے آگے

قدمائے اہل کمال، عبید اللہ مبارک پوری۔ قولی رپورٹ، مولوی عبد الغنی۔ تقریظات، اڈیٹر۔ مخلوقات میں عورت کا درجہ، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ مسدس قومی، کشاف۔ خطاب بہ مومن، بسمل آردی۔ طلب تعلیم باعث اتفاق ہے، تمنا عمادی۔ محسوسات جوش، جوش ملیح آبادی۔ جذبات تمر، تمر ہندو معصطفے الکمال پاشا، عبد القیوم جاوری۔

جلد اول، چوتھا شمارہ۔

شذرات، اڈیٹر۔ دل چسپ معلومات، م ح ل۔ اسلام اور مساوات، اڈیٹر۔ اخلاقی جرات، محمد یحییٰ۔ ادبیات، عبد القادر تحسین۔ حسب و نسب، محمد عزیز۔ اصول مساوات اور اس کی حقیقت، شمس الدین شمس۔ کلام وحشت، وحشت۔ دعا کا دو صحت کے لئے مجھ کو دعا دینا، وحشت کلکتوی۔ غلامی اور اسلام، محمد حنیف اللہ۔ صنعت و حرفت، ابو القاسم سیف بنارسی۔ جذبات ناطق، ناطق لکھنوی۔ پردہ دری، مرزا سلطان احمد خاں۔ ایک مظلوم مومن کا رنگ تغزل، موتمن۔ ہماری شناخت، عبد الغنی۔ تمر صبح، ولی حیدر گوہر بلگرامی۔ وکیل، فاطمہ خانم۔ جواہر ریزے، بسمل آردی۔ قدمائے اہل کمال، عبید اللہ مبارک پوری۔ قومی رپورٹ۔ خطاب بہ مومن، بسمل آردی۔

اقبال کرشن

المومن: کلکتہ کا ایک قدیم ماہی رسالہ

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل میں کلکتہ سے ایک ماہی رسالہ المومن نکلنا شروع ہوا تھا۔ دراصل یہ ہندوستان کی مومن برادری کے ترجمان کی حیثیت سے جاری ہوا تھا۔ اس کے قلمی معاونین میں وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی، جوش ملیح آبادی، مولانا تمنا عمادی وغیرہ بھی شامل تھے اور باقاعدہ چھپتے تھے۔ پہلی جلد کے چاروں شمارے اس وقت میرے پیش نظر ہیں اور رونمائی انھیں کی کرانا چاہتا ہوں۔ کوشش ہمیشہ اس کی ہونی چاہیے کہ تاریخ اردو کا ایک صفحہ بھی ضائع نہ ہو۔

پہلی جلد کے پہلے شمارے کے سرورق کی عبارتوں کو نقل کئے دیتا ہوں تاکہ سرورق کی ایک دھندلی سی تصویر سامنے آجائے۔

ایک قومی رسالہ

المومن

ہندوستان میں قوم نورباف کا پہلا ارگن

جلد ا بابت نمبر ا

ماہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۲۳ء

مطابق جمادی الاول جمادی الآخر رجب ۱۳۴۱ھ

مدیر

محمد یحییٰ مومن

مطبوعہ عبدالغنی پریس نمبر ۴۳ بنیاپوکھر روڈ کلکتہ۔

آئیے اب ایک ایک شمارہ کا مطالعہ کریں۔ جلد اول پہلا شمارہ

فہرست:

حصۂ نثر: انتساب، اڈیٹر

خواب اور اس کی تعبیرات (مقالہ افتتاحیہ)، المومن، عبدالرحمان ندوی نگرامی، المومن، مولانا شائق احمد عثمانی۔ حبیب اللہ، مرزا سلطان احمد خاں، ہمارا قومی لقب کیا ہونا چاہیے؟ محمد یحییٰ۔ المسیح والغزل، ابوالقاسم سیف بنارسی۔ قوم نورباف کی تصویر مثالی، امام الدین رام نگری۔ علامہ تذکرہ و سوانح، عبیداللہ مبارک پوری۔ نسائیات، ر۔ح۔ن۔ شذرات، اڈیٹر۔

حصۂ نظم: المومن افتخار شہر، خیر رحمانی دربھنگوی۔ حرص مومن، مومن۔ غزل، دید سپردم کیا تماشہ ہے نگاہ یار ہوتا ہے، وحشت کلکتوی۔ غزل، عبدالقادر حسین۔ علم کا خطاب مسلمانوں سے، عبدالنور دربھنگوی۔ اخبار ابوالحسن کا شفق۔ قوم کی فریاد پیشوائے قوم سے، محمد لطف اللہ خستہ۔

پشت ورق پر اسلامی مساوات پر ریویو۔ سالانہ چندہ عوام سے ڈیڑھ روپیہ۔ والیان ریاست اور گورنمنٹ سے ۱۰ روپیہ۔ نمونہ کا پرچہ ۸ آنے۔ کاتب ابوالحسنات گیاوی۔

جلد اول، دوسرا شمارہ۔

شذرات، اڈیٹر۔ ایک فروری اپیل، اڈیٹر۔ محسوسات حکیمانہ، جوش ملیح آبادی۔ اسلامی تہذیب پر ہندوستان کا اثر، ابوالحسن کاشف۔ تقسیم عمل اور فرقہ بندی، مرزا سلطان احمد خاں۔ ہمارا قومی لقب کیا ہونا چاہیے؟ محمد یحییٰ۔ صنعت و حرفت، ابوالقاسم سیف بنارسی۔ قدمائے اہل کمال، محمد عبید اللہ۔ قومی ترقی کے زینے، امام الدین رام نگری۔ تحقیق تشابہات، کیفی چریاکوٹی۔ صحابیات اور دور حاضرہ کی مسلمان عورتیں، عبدالسلام ندوی۔ نعت سرور کائنات، آغا محمد شاہ کاشمیری۔ غزل ولشاد جاودانی آشنائے کام جاں کردم، وحشت کلکتوی۔ ادبیات، عبدالقادر حسین۔ غزل، شمس الدین شمس۔ قطعات، عبدالرحمن اختر گڈوی، سہیل اختر۔

آخری صفحے کے زیریں حصے میں "خادم کعبہ" نامی ماہوار رسالہ پر تبصرہ۔ سید الطاف حسین کی ادارت میں سیوڑھ سے نکلتا تھا

جلد اول تیسرا شمارہ۔

شذرات، اڈیٹر۔ ایک مقالہ، اڈیٹر۔ تذکرہ سے ایک اقتباس، ابوالکلام آزاد۔ تقسیم عمل اور فرقہ بندی، محمد یحییٰ۔ ہمارا قومی لقب کیا ہونا چاہیے؟ محمد یحییٰ۔ صنعت و حرفت، ابوالقاسم سیف بنارسی۔ کیا کرنا چاہیے؟ محمد حفیظ اللہ۔ پردہ دری، مرزا سلطان احمد خاں۔

(باقی صفحہ ...)

صلاح الدین پرویز

شکست

تیری مخمور آنکھیں
اداسی کی گاڑھی لکیریں نہیں
اور یہ دو لکیریں!
جسم کی سخت دیوار کو توڑ کر
خون میں حل نہیں ——

اور!
میری پسماندگی
شکل ایک مکڑی کی دیکھے مجھے
تمنا کے اندھے گھنے جنگلوں میں چھوڑ کر
اپنی آواز کا گہرا اجوالم
سنانے کے کارن
آسماں کے کسی نقطۂ خاص میں چھپ گئی

اور پھر میرا پورا وجود
یاد کا جال بننے لگا ——
چند برسوں کے بعد
سینگھ کالے اٹھے
آکاش نے چھید کر ڈالے اپنے بدن میں
تیز ور شا ہوئی
اور پھر یہ زمیں!
بن گئی ایک ساگر ——
اور میری پسماندگی!
آسماں کے اسی نقطۂ خاص کے ساتھ
اس زمیں پر جو ساگر تھی اب
گر پڑی ——
آسماں؛ اس عمل سے خشک ہو کے سکڑنے لگا
اور میں نے اپنے سبھی تجربوں سے
ہوشیاری، ذہانت جمع کر کے اپنی نظر میں
آسماں تا زمیں
ایک جال سا بن دیا
لیکن!
ہار میری ہوئی
میرا پورا وجود
یاد کے جال میں پھنس گیا تھا ——

مراسلات

دیوانِ غالب کا نو دریافت نسخہ

راقم السطور ماہرین غالبیات کی توجہ ایک ماخذ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ قصبہ لاہرپور ضلع سیتاپور میں حاجی سید شاہ ولایت احمد صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ تھا اس نسخے کے وہاں پہونچنے کی روایت یہ ہے کہ ہنگامہ غدر کے دوران جب مولانا فضل حق خیرآبادی کو بغاوت کے جرم میں قید کیا گیا اور خیرآباد میں ان کے محل کو کھود ڈالا گیا اور ان کا سامان تلف کر دیا گیا اس وقت کتب خانے کی بچی کچھی کتابیں لاہرپور آگئیں۔ ان میں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان بھی تھا جو ان کے پاس بغرض اصلاح بھیجا گیا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد مولانا فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب (رامپور میں مدرسہ عالیہ کے افسر مدرس تھے) لاہرپور تشریف لائے اور چند کتابیں لے گئے ان میں مسودہ دیوان غالب بھی تھا۔ ان تمام تفصیلات کا علم اس وقت ہوا جب مولانا ابوالکلام آزاد[1] نے مولانا فضل حق کے کتب خانے کی کتابیں دیکھنے کا شوق ظاہر کیا۔ مولانا آزاد یہ بھی چاہتے تھے کہ ان میں چند کتابیں حکومت ہند خرید لے حاجی سید شاہ ولایت احمد صاحب مرحوم ان کتابوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان معاملات میں انھوں نے مکمل خاموشی اختیار کرلی نتیجہ یہ ہوا یہ کتابیں آج بھی لاہرپور میں محفوظ ہیں۔

شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب کا زیادہ تر قیام رامپور میں رہا ہے۔ ان کی نجی کتابوں کا کیا حشر ہوا کچھ پتہ نہیں چلتا ان کے جو عزیز اب خیرآباد میں ہیں وہ بھی اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نو دریافت نسخہ کا جائزہ لیا جائے ممکن ہے یہ وہی نسخہ ہو جو غالب نے مولانا فضل حق خیرآبادی کو بھیجا تھا۔ ● شریف الحسن عثمانی

اردو ذریعۂ تعلیم

یکم ستمبر ۱۹۹۶ء کے "ہماری زبان" میں جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا ایک مراسلہ "اردو ذریعہ تعلیم" کے زیر عنوان شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے "ہماری زبان" کے ایک اداریہ سے پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی رفع فرمائی ہے۔ اداریہ میں لکھا تھا کہ شاید ہی کسی یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو ہو، صرف بعض جگہ اردو میں جوابات دینے کی سہولت ہے۔ فاروقی صاحب نے بجا طور پر متوجہ کیا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی۔ اے، بی۔ ایڈ، ایل۔ ایس۔ سی اور بی اسکالرز تک ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی چند سال پہلے اپنے آرٹس کے امتحانات کے لئے اردو ذریعہ تعلیم کو تسلیم کرلیا ہے۔ چنانچہ اسی اجازت کے تحت خانگی کوشش سے حیدرآباد میں ایک اردو آرٹس کالج گذشتہ چھ سال سے کام کر رہا ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اسی سال سے ریاستی حکومت نے تلگو ذریعہ تعلیم کے جونیر کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی بدولت جب ضرورت اردو ذریعہ تعلیم کے جونیر کالج بھی قائم ہوں گے اور اس کے نتیجے میں آئندہ خود عثمانیہ یونیورسٹی کے کالجوں میں بھی تلگو کے ساتھ ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں قائم ہو جائیں گی۔ جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے فاروقی صاحب کے ساتھ ہم بھی پر امید ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ مکمل طور پر اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی بن جائے گی۔ لیکن اردو ذریعہ تعلیم کا سب سے زیادہ حق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ہے اور سارے ہندوستان کی آنکھیں اس بارے میں علی گڑھ پر لگی ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ارباب اقتدار ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

حیدرآباد۔ ● سری نیواس لاہوٹی

نسخۂ بھوپال اوّل ہی درست ہے

(۱)

۲۲ اگست کے "ہماری زبان" میں ڈاکٹر گیان چند نے بھوپال سے حال ہی میں دریافت ہونے والے غالب کے خود نوشت نسخہ کو نسخۂ بھوپال اوّل کہنے کے بارے میں جو مراسلہ تحریر فرمایا ہے وہ ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ یقیناً ہر ادب دوست ان کے دلائل سے متفق ہوگا۔

تحقیق کے صحیح منصب اور دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ غالب کا زیر بحث خود نوشتہ دیوان بھوپال سے دریافت ہوا ہے اس لئے اسے بھوپال کے نام سے ہی نسبت دی جائے اور اس کے لئے "نسخۂ بھوپال اوّل" بالکل مناسب نام ہے۔

(۲)

"ہماری زبان" کے اسی شمارہ میں ایک اور مراسلہ شائع ہوا ہے۔ عام اطلاع کے لئے عرض ہے کہ "مجلس اردو" نام کی بھوپال میں ایک باقاعدہ ادبی تنظیم موجود ہے۔ اس کے اکثر شاعروں کی کارروائیاں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مجلس اردو قطعاً گمنام نہیں ہے جیسا کہ مراسلہ نگار نے ظاہر کیا ہے۔ مجلس اردو کے دو تین شاعروں میں مجھے خود شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ نیز یہ کہ شفیق الحسن فضلی کے جلسے کی کارروائی بھی جعلی نہیں ہے۔ کیونکہ مجلس اردو کے اس جلسہ کی کارروائی بھوپال کے قریب قریب تمام روزناموں میں بھی شائع ہوئی اور کسی نے اس کی تردید نہیں کی۔ اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ جلسہ بھی ضرور ہوا۔ مراسلہ نگار نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ حالانکہ انھوں نے خود کو بھوپال کا ظاہر کیا ہے۔ پھر یہ لاعلمی حیرتناک ہے!

● آفاق احمد بھوپال

ایک نادر و کمیاب فارسی تاریخ

ایک فارسی تاریخ روضۃ الصفا تالیف محمد خاوند شاہ مطبوعہ ۱۲۰۰ھ جو اب کمیاب ہے میرے پاس برائے فروخت موجود ہے۔ ضرورت مند اصحاب ذیل کے پتے پر رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ ● قیوم صادق لکچرر شعبہ اردو و فارسی
گورنمنٹ مہارانی کالج میسور ۵

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد کے والد شاگرد تھے مولانا فضل حق خیرآبادی کے والد کے۔

انجمن ترقی اردو دلی کا سالانہ بہاریہ مشاعرہ

۲۸ اگست کو علمی منزل میں انجمن کا سالانہ بہاریہ مشاعرہ زیر صدارت جناب یونس سلیم صاحب نائب وزیر قانون ہوا۔ مشاعرے کے لئے مصرع طرح "محدود جن تک مری پرواز نہیں ہے" دیا گیا تھا جن شعراء نے طرحی مشاعرہ میں حصہ لیا ان میں سے چند اسمائے گرامی یہ ہیں، سلام مچھلی شہری، مخار دہلوی، رفعت سروش، بہار برنی، حیات لکھنوی، حلیم اختر مظفر نگری، ظفر ادیب، فتح چند نیر، تسلیم دہلوی اور طالب چکوالی۔

صاحب صدر نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں فرمایا: "اردو شاعروں نے ہمیشہ جمہور کے احساسات کی ترجمانی کی ہے اور جمہور کے تقاضوں کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا ہے، آج جبکہ ہماری سیاست میں وہ فیصلہ کن موڑ آگیا ہے جس کا ہمیں گذشتہ بیس برس انتظار تھا مجھے توقع ہے کہ اردو شاعر اس بار بھی بالکل اسی طرح جمہور کے نئے تقاضوں کو پورا کریں گے جس طرح انھوں نے جنگ آزادی کے دوران انگریزی سامراج کے خلاف ہندوستانی عوام میں حصول آزادی کی روح پھونکی تھی۔"

انجمن ترقی اردو پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ انجمن نے بہت سے مفید کام سرانجام دیئے ہیں۔ اب انجمن کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ سائنس، ٹیکنالوجی، معاشیات اور دوسرے مضامین کی کتابیں تیار کرے ناشر اپنے مخصوص مفاد کے سبب یہ کام نہیں کر سکتے۔

کشمیر اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہوگا۔

لیکن اگر کتابیں میسر نہ آئیں اور اردو طالب علم یونیورسٹیوں میں نہ آئے تو ظاہر ہے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ آپ نے حکومت ہند کے اردو بورڈ قائم کرنے کے فیصلہ کا تذکرہ کیا اور کہا کہ انجمن ترقی اردو بورڈ کی صحیح رہنمائی کر کے اردو زبان کی بیش بہا خدمت انجام دے سکتی ہے۔

مشاعرے کے خاتمے پر جناب بہار برنی صاحب نے شعرائے کرام اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

● سکریٹری

ہماری زبان کے اداریے

۱۹۶۸ء میں ہماری زبان میں جو اداریے لکھے گئے ان کا اشاریہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

نمبر شمار	عنوان	ہماری زبان بتاریخ
۱۔	نیا سال؛ دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے	۶۸-۱-۱
۲۔	زبان کے سلسلے میں ہوش مندی کی ضرورت	۶۸-۱-۸
۳۔	سہ لسانی فارمولا اور اردو	۶۸-۱-۱۵
۴۔	یوم جمہوریت	۶۸-۱-۲۲
۵۔	مرکزی زبان کے سلسلے میں کشمکش	۶۸-۲-۱
۶۔	علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم اور اردو	۶۸-۲-۸
۷۔	کچھ غالب کی صد سالہ برسی کے بارے میں	۶۸-۲-۱۵
۸۔	انجمن کی عمارت کے لئے فنڈ کی اپیل	۶۸-۲-۲۲
۹۔	انجمن کی شاخوں کے انتخاب اور بعض علمی کام	۶۸-۳-۱
۱۰۔	اردو گھر کی تعمیر کے لئے چندہ	۶۸-۳-۸
۱۱۔	اردو گھر	۶۸-۳-۲۲
۱۲۔	اقبال کی یاد میں	۶۸-۴-۲۲
۱۳۔	انجمن کے تازہ فیصلے اور اردو گھر کی تعمیر کی مہم	۶۸-۵-۱
۱۴۔	لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ	۶۸-۵-۸
۱۵۔	،،	۶۸-۵-۱۵
۱۶۔	اردو دوستوں سے خطاب	۶۸-۵-۲۲
۱۷۔	لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی آٹھویں رپورٹ	۶۸-۶-۱
۱۸۔	بنیادی مسائل پر پہلے توجہ کیجئے	۶۸-۶-۱۵
۱۹۔	اردو گھر کے لئے چندے کی فراہمی	۶۸-۶-۲۲
۲۰۔	اتر پردیش کی ریاستی شاخ	۶۸-۷-۱
۲۱۔	یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کی تیسری کانفرنس	۶۸-۷-۸
۲۲۔	بنارس کی کارپوریشن اور اردو	۶۸-۷-۱۵
۲۳۔	کیا اردو کا مسئلہ محض سیاسی ہے	۶۸-۷-۲۲
۲۴۔	غالب کی برسی کے سلسلے میں کاموں کی تنظیم کی ضرورت	۶۸-۸-۸
۲۵۔	آزادی کے اکیس سال	۶۸-۸-۱۵
۲۶۔	اردو گھر کے لئے چندہ	۶۸-۸-۲۲
۲۷۔	پریس رجسٹرار کی رپورٹ	۶۸-۹-۱
۲۸۔	اردو گھر	۶۸-۹-۸
۲۹۔	ایک روشن چراغ تھا نہ رہا	۶۸-۹-۱۵
۳۰۔	ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے	۶۸-۹-۲۲
۳۱۔	گاندھی جی کو سچا خراج عقیدت کیا ہونا چاہئے	۶۸-۱۰-۱
۳۲۔	کیا ہم اپنی تاریخ کو جھٹلا سکتے ہیں؟	۶۸-۱۰-۸
۳۳۔	یوم سرسید	۶۸-۱۰-۱۵
۳۴۔	رسم خط کا مسئلہ	۶۸-۱۰-۲۲
۳۵۔	اردو گھر فنڈ	۶۸-۱۱-۱
۳۶۔	یونیورسٹیوں کے اردو استادوں کی تیسری کانفرنس	۶۸-۱۱-۸
۳۷۔	جواہر لال نہرو کا جنم دن	۶۸-۱۱-۱۵
۳۸۔	غالب صدی کے کام	۶۸-۱۱-۲۲
۳۹۔	اپٹن سنکلیر	۶۸-۱۲-۱
۴۰۔	غالب اکیڈمی	۶۸-۱۲-۸
۴۱۔	انسانی حقوق کا احترام	۶۸-۱۲-۱۵
۴۲۔	طلبہ کی بے چینی اور ہمارا فریضہ	۶۸-۱۲-۲۲

(باقی کالم ۱ میں دیکھئے)

باقی کالم ۲ سے آگے

مرتبہ: اسلام الدین قریشی

اخبار و اذکار

انجمن ہم عصر علی گڑھ کی ادبی نشست

علی گڑھ کے طلبہ کی ادبی انجمن ہم عصر کی اس سال کی پہلی نشست ۳ ستمبر ۶۹ء کو سر سید ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت کے فرائض جناب تصدق حسین نے انجام دئے۔ نشست کا آغاز تصدق صاحب کی ایک مختصر تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے ہم عصر کی گذشتہ سہ سالہ سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ یہ انجمن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بہت کامیاب رہی ہے اور اس نے طلبہ کی نسل میں کئی اچھے لکھنے والے پیدا کئے ہیں۔ تحسین کی گونج میں جناب صدر نے "ہم عصر" کے ایک رکن کبیر احمد جائسی صاحب صبا کو ان کے مجموعہ کلام "صحرا صحرا" کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔

شعری نشست کا آغاز احمد اللہ صدیقی کے کلام سے ہوا۔ اس کے بعد انیس انصاری، احمد نقوی، مرغوب حسن، شہاب عراقی، اعجاز اختر، مرزا خلیل بیگ اور صبا جائسی نے اپنی اپنی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ نثری دور میں اعجاز اختر نے اپنا ایک مختصر افسانہ "پیاسا اور آخری احساس" کے زیر عنوان سنایا۔ مرزا خلیل بیگ نے دور جدید کی انگریزی شاعری کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ گذشتہ تمام نشستوں کی طرح یہ نشست بھی نہایت کامیاب رہی۔

● مرزا خلیل بیگ کنوینر "ہم عصر"

غالب اور انیس کا تقابل۔ روداد غالب صدی

"انیس اکیڈمی" (حیدرآباد) کے زیر اہتمام "غالب صدی" کے سلسلہ میں ایک خصوصی ادبی اجلاس ۲۴ اگست ۶۹ء کی شام کو ۵ بجے دیوڑھی نواب عنایت جنگ بہادر منعقد ہوا جس کی صدارت جناب شہریار کاڈس جی صاحب نے فرمائی۔

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب سابق پروفیسر صدر شعبہ سماجیات عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے توسیعی لکچر میں انیس اور غالب کا تقابل کرتے ہوئے فرمایا کہ دونوں عظیم شاعروں کی زندگی، مزاج اور ان کے اصناف سخن میں عدم یکسانیت اور تضاد کے باوجود ان میں ایک قدر مشترک یہ پائی جاتی ہے کہ غزل اور مرثیہ کی اصناف میں اردو کا کوئی شاعر ان کی ہمسری نہ کر سکا۔

جناب شہریار کاڈس جی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کے مقالہ کو حقیقی معنوں میں ایک نرالا تقابل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ادب میں شعرا کا تقابل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انیس اور شیکسپیئر کے انگریزی تقابل اور مولانا شبلی کے "موازنۂ انیس و دبیر" سے لکھنؤ کے ڈاکٹر فدا حسین صاحب کے "انیس اور فردوسی" تک متعدد ادبی موازنے منظر عام پر آچکے ہیں۔ تاہم غالب اور انیس کی زبان، اسلوب بیان، ہئیت اور مواد کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے جس خوبصورتی سے دونوں شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا ہے وہ ان کی جدت طبع کا ثبوت ہے۔ جناب شہریار کاڈس جی نے غالب کو ایک بین الاقوامی شاعر قرار دیتے ہوئے انیس اکیڈمی سے اس توقع کا اظہار کیا کہ انیس کے کلام کو عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

ابتدا میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر "انیس اکیڈمی" نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سال "غالب صدی تقاریب" ساری دنیا بالخصوص ہندوستان میں جس شان و شوکت سے منائی جا رہی ہیں اس پر اردو والے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

● اصغر نقوی آرگنائزر

انجمن "نئے زاویے" کی ادبی نشست

گورکھپور۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی آمد پر ان کے اعزاز میں "نئے زاویے" کی یکے بعد دیگرے متعدد نشستیں منعقد ہوئیں۔ پہلی نشست صدر ادارہ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی قیام گاہ پر ۱۹؍اگست کی شام کو ہوئی۔ فاروقی صاحب نے "نئے زاویے" کے اراکین سے کہا کہ وہ فن کے معاملہ اپنا محاسبہ خود کریں۔ اپنی گفتگو میں انھوں نے ادب میں گروپ بندی کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جدیدیت کوئی تحریک نہیں ہے۔

فاروقی صاحب نے ترقی پسند تحریک کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فراق یا جوش و فیض کو ہم اپنا مانتے ہیں جبکہ ترقی پسند حضرات اس معاملہ میں خود مصلحت کوشی سے کام لیتے ہیں جب جسے چاہا نکال باہر کیا اور جب جسے چاہا پارٹی میں شامل کر لیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر سلام نے "آورد" پر اپنا مقالہ، ایم۔ کوٹھیاوی راہی نے ایک کہانی "سوئی ہوئی سڑک" اور محمد احسن رضوی نے "نئے زاویے" کے متعلق ایک مضمون پڑھ کر سنایا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی متعدد غزلیں، ڈاکٹر سلام، ایم۔ کوٹھیاوی راہی، محمد احسن رضوی اور ناظر اشاکری نے نظمیں، الیشوری پرشاد گوہر، اشفاق احمد اعظمی، شوکت علوی، حسین اشک اور مقبول احمد مقبول نے غزلیں سنائیں۔

● محمد احسن رضوی، ناظم نشر و اشاعت "نئے زاویے" گورکھپور

نظر برنی کے مجموعۂ کلام "متاعِ نظر" کی رسم اجرا

نئی دہلی۔ کچھ دنوں پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک جلسے میں سید نظر برنی کے مجموعۂ کلام "متاعِ نظر" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر شفیقی برہمی نے فرمائی اور رسم اجرا شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی کے ریڈر جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادا کی۔ قدوائی صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ نظر برنی کے یہاں قدیم اور جدید آہنگ ملتا ہے اور یہ آہنگ پڑھنے والے کے دل کو گدگدائے بغیر نہیں رہتا۔ شفیقی صاحب نے فرمایا کہ نظر صاحب بہت جلد نوجوان شعرا کی صف میں اپنا مقام پیدا کر لیں گے۔ مرکزی وزیر مواصلات پروفیسر شیر سنگھ نے اپنے پیغام میں نظر برنی کی شاعری کو نوجوان نسل کی نمائندہ شاعری قرار دیا۔ رسم اجرا کے بعد ایک مختصر شعری نشست میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، سید نظر برنی، سلطنت رسول، محمد یوسف پاپا، رشید الواحدی، جے پال سنگھ ترنگ اور شیام سرد پیشر ما صاحبان نے اپنا کلام سنایا۔

● جے پال سنگھ ترنگ

مخدوم محی الدین کی وفات پر تعزیتی جلسے

مخدوم محی الدین کی موت سے ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا احساس ایک عرصے تک باقی رہے گا۔ ملک کے طول و عرض میں مختلف اداروں، انجمنوں اور مجالس نے ان کی وفات کا سوگ منایا ہے اور مختلف جلسوں میں تعزیتی تجاویز کے ذریعہ اس سانحے پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ادارہ ہماری زبان کو جن تعلیمی اداروں، انجمنوں اور مجالس کی جانب سے تعزیتی تجاویز کی نقلیں موصول ہوئی ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ شعبۂ اردو،
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

۲۔ شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

۳۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز،
سری نگر (کشمیر)

۴۔ انجمن ترقی پسند مصنفین،
جامعہ نگر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۵۔ انجمن اردوئے معلیٰ،
سیفیہ کالج بھوپال،

۶۔ کل ہند شعراء کانفرنس،
انجمن توسیع اردو، کلکتہ

۷۔ انجمن ترقی اردو
بھوپال

۸۔ حلقۂ ارباب ادب
بھوپال

۹۔ بزم فنکار
بھوپال

۱۰۔ ادارہ تجدید ادب
بھوپال

۱۱۔ بزم ادب حمیدیہ کالج
بھوپال

۱۲۔ انجمن نقیب ادب
بھوپال

۱۳۔ ادارہ ترقی ادب
بھوپال

نوٹ:۔ بھوپال کی متذکرہ انجمنوں نے ایک مشترکہ جلسے میں تعزیتی قرارداد منظور کی۔

مخدوم محی الدین نمبر

ادارہ شاہ کار ادبی ڈائجسٹ، الہ آباد نے ایک اطلاع بھیجی ہے کہ شاہ کار کا مخدوم محی الدین نمبر ان دنوں زیر ترتیب ہے۔ اس نمبر میں مخدوم کے فن اور شخصیت پر مشاہیر اہل قلم کے مضامین اور منظومات کا انتخاب شامل ہوگا۔ دو سو صفحات کے اس نمبر کی قیمت دو روپیے ہوگی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات منیجر شاہ کار، ۱۳/۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مخدوم محی الدین اسکالرشپ

حیدرآباد۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ ورکشاپ ورکرس یونین کے ایک اعلان کے مطابق یونین کی جانب سے محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لیے ایک "مخدوم محی الدین اسکالرشپ" قائم کیا گیا ہے۔ یہ وظیفہ مستحق بچوں کو حصول تعلیم میں سہولت دینے کی غرض سے شروع کیا گیا ہے اس انجمن کا قیام مخدوم ہی کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا اور وہی اس کی صدارت کے فرائض تا حیات انجام دیتے رہے۔

مخدوم کی یاد قائم کرنے کی مختلف تجویزیں

ادیبوں کے ایک جلسے میں جو بزم صبا کی جانب سے مخدوم محی الدین کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کے لیے جناب سلیمان اریب کی قیام گاہ پر منعقد ہوا، طے کیا گیا ہے کہ مخدوم کی یاد میں ہر سال ایک کل ہند نوعیت کا سیمینار اور مشاعرہ منعقد کیا جائے، مخدوم کے نام سے ایک لائبریری قائم کی جائے، مجلس بلدیہ حیدرآباد سے خواہش کی جائے کہ مخدوم کی قیام گاہ جس روڈ پر واقع تھی، اسے مخدوم کے نام سے منسوب کیا جائے، عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ میں مخدوم کے نام سے ایک چیئر قائم کرنے کی تحریک کی جائے، عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ کرنے والے کسی موزوں امیدوار کو اسکالرشپ دیا جائے، عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں اعزازی طور پر کامیابی حاصل کرنے والے طالب علم کو مخدوم میڈل دیا جائے، صبا کا مخدوم نمبر نکالا جائے اور مخدوم پر ایک کتاب چھاپی جائے جو ان کی ادبی حیثیت اور شخصیت سے متعلق ہو، انجمن ترقی اردو ادبی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی وساطت سے کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جس سے مخدوم کے متعلقین کی باوقار طریقہ پر اعانت ہو سکے، ۲۸ ستمبر کو مخدوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے جس میں مخدوم پر مضامین پڑھے جائیں اور مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد کی بنائی ہوئی مخدوم کی تصویر کی نقاب کشائی کی جائے۔ بزم صبا کے اس جلسہ میں جس کی صدارت پروفیسر حسن عسکری نے کی، آخر میں دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں مخدوم کی شخصیت اور شاعری کو خراج عقیدت ادا کیا گیا۔

متفرقات

بھوپال میں غالب کے تین نادر خطوط کی دریافت

بھوپال:- مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال جسے آج تک اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ۵۰ سال کی عمر تک کے کلام پر مشتمل دیوان کی دریافت پر ناز تھا (یہ کلام ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ میں شائع ہوا) اس نے غالب صدی کے زمانہ میں دو مزید ادبی دریافتوں کے ذریعہ اپنے سر افتخار کو اور بلند کر لیا ہے۔

ابھی کچھ مہینے قبل بھوپال سے غالب کے کلام کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا تھا جو ان دنوں امروہہ کے ایک تاجر کتب کے پاس ہے۔ یہ نسخہ جہاں غالب کے کلام کا سب سے قدیم نسخہ ہے وہاں اس کی دوسری اہم صفت یہ ہے کہ مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیق کے مطابق یہ غالب کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نو دریافت نسخہ میں غالب کا ۱۸۱۸ء تک کا کلام ملتا ہے گویا خود نوشت دیوان میں ۲۱ سال کی عمر تک کا مرزا کا کلام موجود ہے۔

اس نو دریافت نسخہ کے علاوہ پچھلے ماہ بھوپال میں مرزا غالب کے ہاتھ کے لکھے تین مکاتیب بھی دریافت ہوئے ہیں یہ خطوط غالب کے بھوپالی شاگرد مولانا عباس رفعت شروانی کے نام ہیں اور ۱۲۷۸ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ انھیں پروفیسر آفاق نے اپنی ننہال میں صوبیدار یحییٰ رضا کے ذخیرہ سے برآمد کیا ہے۔ رضا میاں صاحب مولانا عباس رفعت کے پوتے ہیں۔ ان خطوط میں سے دو اردو میں ہیں اور ایک فارسی میں، فارسی کا خط مطبوعہ ہے اور غالب کے خطوط کے مجموعہ پنج آہنگ کے علاوہ کلیات نثر فارسی، انشائے نور چشم ایار محمد خاں شوکت) اور انشائے خوردیدہ (قلمی محمد عباس رفعت) میں موجود ہے۔ اس پر غالب کی مہر ہے۔ اردو کے خطوط غیر مطبوعہ ہیں اور غالب کے مخصوص رنگ میں ہیں۔ ان دو غیر مطبوعہ خطوط کی دریافت سے غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر آفاق احمد نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا ہے جو ایک موقر ادبی جریدہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بھوپال غالب کے سلسلے میں ان دریافتوں پر جتنا ناز کرے کم ہے۔ ● قومی آواز

محبوب نگر میں غالب ہال کا سنگ بنیاد

محبوب نگر:- ایڈیشنل چیف سکریٹری جناب ایس اے قادر نے غالب ہال کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے غالب کے فکر و فن کو خراج تحسین ادا کیا اور عوام کو مشورہ دیا کہ وہ اس عظیم المرتبت شاعر کے کلام کو سمجھے اور اس کے نظریات کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ انھوں نے باشندگان محبوب نگر کو اپنے شہر میں اس ہال کی تعمیر پر مبارکباد دی۔ کلکٹر ضلع مسٹر وی۔ کے۔ راؤ نے اپنی صدارتی تقریر میں یقین دلایا کہ ہال کی تعمیر بہت جلد تکمیل پا جائے گی۔ انھوں نے عوام سے بھی اپیل کی کہ وہ اس ہال کی تعمیر کے لئے فراخدلانہ عطیے دیں۔ انھوں نے تلگو پنڈتوں سے درخواست کی کہ وہ غالب کے کلام کا تلگو زبان میں ترجمہ کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے اعلیٰ نظریات کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ ڈسٹرکٹ ریونیو آفیسر مسٹر محسن الدین احمد نے محبوب نگر کے عوام کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس ہال کی تعمیر سے غالب کے نظریات کے پرچار میں مدد ملے گی۔ اردو کے اس عظیم المرتبت قومی شاعر کے فکر و فن پر جناب پی ہنمنت راؤ، رام چندر ریڈی، مسٹر رنگیا اور صولت نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شکریہ کے بعد یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔ ● رہنمائے دکن

پرائمری اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہوگی

مدھیہ پردیش حکومت کا مستحسن حکم

بھوپال:- ایک اطلاع کے مطابق مدھیہ پردیش کی صوبائی سرکار نے پرائمری اسکولوں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا حکم دیدیا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اردو والے اس سلسلے میں ایک درخواست کے ذریعہ حکومت کو متوجہ کرنے سے غافل نہ رہیں۔ صوبائی سرکار نے اس ضمن میں جو سرکلر جاری کیا ہے اس کا متن درج ذیل ہے۔

مراسلہ نمبر ۳-۸×۳۹۹۱م مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۷۰ء کے پی شریواستوا انڈر سکریٹری گورنمنٹ، آف مدھیہ پردیش محکمہ تعلیمات کی طرف سے برائے ڈائریکٹر آف پبلک، انسٹرکشن مدھیہ پردیش بھوپال اقلیتی زبانوں کے بچوں کے ذریعہ تعلیم کے بارے میں مدھیہ پردیش کے تمام اسکولوں کے لئے۔

(الف) کسی بھی اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کی مادری زبان مندرجہ ذیل زبانوں میں سے ایک ہو وہ اپنی ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کریں گے۔

(۱) بنگالی (۲) گجراتی (۳) مراٹھی (۴) اڑیہ (۵) پنجابی (۶) سندھی (۷) اردو۔

(ب) کسی بھی اسکول میں جہاں اقلیتی زبان بولنے والے طلبہ کی تعداد چالیس یا درجہ میں دس ہوگی تو اس اسکول میں کم سے کم ایک استاد

کا تقرر ہونا چاہیے تاکہ وہ اساتذہ ان طلبہ کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دے سکے۔
یہ اسی وقت ہوگا جبکہ متعلقہ عوام کی طرف سے ایسی کوئی خواہش کی جائے۔

(ج) وہ تمام مقامی ادارے جنھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء کے بعد اپنی ابتدائی تعلیم کا شعبہ منسلک کر دیا تھا اور جس کے یہاں اقلیتی فرقہ کی زبان میں تعلیم ہوتی تھی جس کا ذکر اوپر پیراگراف (الف) میں مذکور ہے ان کو ہدایت دی جائے کہ وہ تمام فرنیچر عمارت اور دیگر سامان اس اسکول کو یا ان مقامی اداروں کو دیدیں جو اس ڈھنگ سے ابتدائی تعلیم دینے پر راضی ہوں۔

(د) ایسا کوئی غیر سرکاری پرائمری اسکول جس میں اقلیتی فرقہ کی تعداد چالیس ہو اور جس کی تعلیم کا بندوبست اسی اقلیتی زبان میں ہو تو اس کو ضابطہ کے مطابق حکومت سے مالی امداد لینے کا حق ہوگا۔

(ہ) جس پرائمری اسکول میں اقلیتی زبان کے طلبہ کی تعداد کافی ہو اور وہ کسی خاص علاقہ میں ہو تو ایسے اسکول کو علیحدہ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کا ذریعہ تعلیم طلبہ کی مادری زبان ہوگی۔

ایسے اسکول (خواہ وہ غیر سرکاری اداروں کے ذریعہ چل رہے ہوں) کو بورڈ سے منظوری کا حق حاصل ہوگا اور حکومت اس کی مالی امداد حسب ضابطہ کرے گی۔

(۲) اوپر کا حکم ان تمام تعلیمی اداروں پر نافذ ہوگا جن پر حسب حکم محکمۂ تعلیم یادداشت نمبر ۰۲-XXIII-۸۶۸/۲۱۶۳ مطابق ۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء سابق حکومت مدھیہ پردیش اور وہ دوسری حکومت کی اکائیاں جو اس میں ضم ہو گئی ہیں جیسے بھوپال مدھیہ پردیش لیکن اسی حد تک، جہاں تک کہ ابتدائی اسکولوں سے تعلق ہے۔

(۳) پوری اسٹیٹ میں اس حکم پر جلد سے جلد عمل ہوگا گورنر صاحب مدھیہ پردیش کے نام جاری کردہ یہ کاپی ت. ۵. ۰. سے لی گئی جس کا نمبر ۱/۲۰/۱۵ B-4 ہے۔

بنارس میں غالب کی قیام گاہیں

لکھنؤ، ڈاکٹر حکم چند نیر شعبۂ اردو ہندو یونیورسٹی بنارس کی آمد کے موقع پر فردوس منظور لاری "وزیر گنج" میں ایک ادبی نشست ہوئی ڈاکٹر حکم چند نے اپنی تقریر میں مرزا غالب کے قیام بنارس کے مسئلے پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مرزا غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط کا ایک مجموعہ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے جن میں کئی خطوط ایسے ہیں جو غالب نے بنارس سے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، ان میں اپنے قیام کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اورنگ آباد کی سرائے کے قریب ایک بڑھیا کے مکان میں ٹھہرے تھے جس کے یہاں چراغ تک کا انتظام نہیں تھا۔

مولانا خیر بہوروی صدر غالب اکاڈمی بنارس نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے اپنی کتاب "غالب اور بنارس" میں مرزا صاحب کی قیام گاہ اور ان کے میزبان خان بہادر مرزا اجمال الدین احمد کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ مرزا غالب جب بنارس پہونچے ہوں تو سرائے کے قریب ٹھہر گئے ہوں پھر مرزا اجمال الدین کی حویلی میں اٹھ آئے ہوں کیونکہ مرزا اجمال الدین کے خاندانی شجرہ میں غالب کے کئی قریبی رشتہ داروں کا نام ملتا ہے۔

ڈاکٹر حکم چند نیر عنقریب بنارس یونیورسٹی میں ایک عام جلسہ کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں جس میں بنارس میں مرزا غالب کی قیام گاہوں کے مسئلے پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کی جائے گی۔ ○ قومی آواز

نیپال میں جشن غالب

بزم ادب نیپال گنج (نیپال) کی جانب سے ۲۷ ستمبر ۶۹ء کو اسلامیہ اسکول میں خصوصی مشاعرہ بہ طرح: "حسن جمال یار ہماری نظر میں ہے" منعقد ہوگا جس میں مقامی و غیر مقامی شاعروں کے علاوہ جناب عارف نیپالی نائب اور ان کے ہمعصر نیپالی شاعر خواجہ بے خبر کے خصوصی تعلقات کے موضوع پر روشنی ڈالیں گے۔ (سیاست)

علاقائی زبانوں میں کاروباری جوابی کارڈ

نئی دہلی۔ کاروباری جوابی کارڈ لفافے اور لیبل اب انگریزی اور ہندی کے علاوہ کسی بھی علاقائی زبان میں چھاپے جا سکتے ہیں۔
محکمۂ ڈاک و تار نے مذکورہ کارڈوں لفافوں وغیرہ پر علاقائی زبانوں کے استعمال کی اجازت دیتے ہوئے مطلع کیا ہے کہ ان پر پرمٹ نمبر اور محصول ڈاک کی ادائیگی وغیرہ کے بارے میں ہدایات انگریزی یا ہندی میں ہونی چاہئیں محکمے نے یہ بھی ہدایت کی ہے کہ ان لفافوں، کارڈوں اور لیبلوں پر بین الاقوامی ہندسے لکھے جائیں۔
○ قومی آواز

صفحہ ۱۰ سے آگے

مجموعی طور پر شہباز حسین اور ان کے رفقائے کار کا یہ کارنامہ ستائش کے لائق ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد چودہ زبانوں کے شعری سفر کی کہانیاں بڑے سلیقے کے ساتھ اس نمبر میں یکجا کر دی ہیں۔ اس سے ایک زبان کے قارئین کو دوسری زبانوں کی شاعری میں جذباتی اور ذہنی اشتراک کا جو تجربہ ملے گا وہ بہت اہم اور حقیقی ہے۔ شہباز حسین کی ادارت سے پہلے بھی آج کل کا اپنا علمی اور تہذیبی مزاج تھا لیکن اس کے شماروں کی یکسانیت اور ان میں روح عصر کا فقدان زندہ ادبی حقیقتوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کوئی سامان ضیافت نہیں رکھتا تھا۔ اب یہ رسالہ صرف لائبریری کے لئے نہیں بلکہ گفتگو، مطالعے اور عصری مسائل کے ادراک کا مواد بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ نمبر نئی شاعری سے بیزار اور اس کے گرفتار ہر دو قسم کے حضرات کو پڑھنا چاہئے کہ اس میں عبرت و تقویت اور تشویش و تسلی دونوں کا سامان موجود ہے۔

صاف ستھرے تصویروں سے مزین اور ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

تبصرہ

ڈاکٹر شمیم حنفی

رسالہ : آج کل (جدید ہندوستانی شاعری نمبر)
ایڈیٹر : شہباز حسین
ناشر : پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

ایک زمانہ تھا جب اردو شاعری مختلف اسکولوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دلی اسکول کا شاعر لکھنؤ اسکول سے اور لکھنؤ اسکول کا شاعر دکنی روایات سے اتنا بیگانہ تھا کہ یہ سب الگ الگ دنیاؤں کے باشندے نظر آتے تھے۔ ایک کا حسن دوسرے کے لئے عیب تھا۔ معیار و میزان کی سطح پر سب ایک دوسرے کے لئے ناقابل قبول تھے۔ اس کے برعکس آج کل کے اس نمبر میں چودہ علاقائی زبانوں کے مختلف شعرا کی تخلیقات پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کے درمیان احساس کا ایک ہی گنجینہ مشترکہ قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی فکر کے خارجی پیکر یعنی زبان و بیان کا فرق میڈیم کا نہیں بلکہ فاؤنٹین پن یا روشنائی کے مختلف رنگوں کا ہے۔ یہ رنگ ایک ہی خیال کی تجسیم کرتے ہیں اور ایک ہی نفسی ادراک کے عکاس ہیں۔ حقیقتوں کا عرفان، تجربے کی شدت و صداقت اور اس کے ردعمل کا تجزیہ تاثر ایک سا ہے۔ المیے کا آہنگ اور افسردہ دلی کی لے ایک سی ہے۔ بے اطمینانی، تشکیک اور تجسس کا مزاج اور حسن و مسرت کی تلاش کا جذبہ ایک سا ہے۔ یہ ہم آہنگی اور رفاقت ذہنی ماحول کے علاوہ ذات اور ذات سے ماورا سچائیوں کے اظہار و انکشاف میں بھی لفظی اور صوتی تلازموں کی ایک ہی فضا تعمیر کرتی ہے۔

اس نمبر میں ہر زبان کے ادب کی رفتار کا جائزہ بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں نمو پذیر رجحانات اور تخلیقی کردار کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے سفر ارتقا میں ۱۹۶۰ء کسی اہم تحریک کا نقطۂ آغاز یا کسی دور رس اور ہمہ گیر واقعے کی ایسی منزل کا درجہ نہیں رکھتا جس نے فکر و فن کے نئے راستوں کی نشاندہی کی ہو۔ لیکن کسی مفکر کا یہ قول اگر ضمنی صداقت بھی رکھتا ہے کہ ایک تصور حیات یا زاویۂ نظر کے تشکیلی مراحل دس برس میں پورے ہو جاتے ہیں تو یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ ۱۹۶۰ء کسی جدید تر حسی نظام کا حرف اول بھی ہو سکتا ہے۔ سیاسی انتشار، معاشرتی بحران، حیات و کائنات کی نو دریافت حقیقتوں کے ظہور، وجود کے ازلی اور ابدی اسرار کے غیاب، صنعتی اور مشینی تہذیب کے عروج اور ترقی معکوس کے عمل سے پیدا شدہ [illegible] متعلق شہرہ آفاق اعلان سے لے کر ہمارے عہد کے ہزیمت سے دوچار عقائد کے ریزہ ریزہ بت۔ ان سب کے بے ہنگم شور کی رفتار پچھلے آٹھ دس برسوں میں بہت تیز رہی۔ اسی عرصے میں ہمارے یہاں دگمبر کویوں، بھوکی پیڑھی اور لفظوں کی بے بضاعتی سے پشیمان اکوتا (اکوتا) کے علمبرداروں نے ایسی آوازیں بلند کیں جن میں فرانس کے دادا شاعروں اور ایلن گنسبرگ کے قبیلے کی بظاہر بے ربط، اور منتشر [illegible] لیکن باطن گہری آوازوں کے شدید شور شامل ہیں۔ تبدیلیوں، تصادمات، قدروں کی شکست اور ان کی تشنگی کے اضطراب کی رفتار اس عرصے میں اتنی تیز ہو گئی کہ عصر حاضر کے پیچیدہ سوالوں کی الجھن نے ماضی کی سادہ لوحی کو بالکل نکما کر دیا۔ حقائق اور عوامل کا یہ رخ اس نمبر کے موضوع کا منطقی جواز پیش کرتا ہے۔

بیشتر مضامین سرسری ہیں اور محض رسمی تعارف کا حق ادا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ تعارف یک رخا ہے۔ مثال کے طور پر بنگالی شاعری سے متعلق مضمون میں جہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ زیر تبصرہ عہد کی بنگالی شاعری کا ایک اہم رجحان موسیقی کی وہ روایت ہے جس کی بنیاد ٹیگور نے رکھی تھی، وہاں اس حقیقت کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ٹیگور ہی کی سرزمین سے وہ شور بھی اٹھا جس کا سب سے بڑا مقصد نئی بنگالی شاعری کو ٹیگور کے رومانی مبہم اور پر اسرار مابعد الطبیعیاتی دھندلکوں سے نکال کر بے حیثیت لیکن ناگزیر حقائق کے سورج کا منہ دکھانا ہے۔ اس سلسلے میں ملے رائے چودھری کی طویل نظم "زخم" کا ذکر لازم تھا اور ان کی جماعت کے دوسرے شاعروں کا تذکرہ بھی ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کے انحراف نے بنگال کے ادبی ماحول کو بڑی شدت کے ساتھ متاثر کرنے کے علاوہ مغربی ممالک کے معاصر شاعروں اور ادبی حلقوں کو بھی متوجہ کیا ہے۔ اسی طرح پربھاکر ماچوے جیسے ذمہ دار ادیب سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ سن ۶۰ء کے بعد کی مراٹھی شاعری کی سمتوں اور اس کے سرچشموں کا تجزیہ کریں گے لیکن انھوں نے مرڈھیکر جیسے عہد آفریں شاعر کا ذکر بھی یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مرڈھیکر نے جمالیات پر بھی لکھا ہے اور ساہتیہ اکاڈمی نے ان کے مجموعۂ مضامین پر ان کی موت کے بعد انعام دیا ہے۔ مرڈھیکر کی فکری انفرادیت اور ان کے پیرایۂ اظہار، بالخصوص صوتی تلازموں اور تمثیلی پیکر تراشی کے رجحان نے جدید تر شاعری پر جو گہرا اثر ڈالا ہے اور اس کی راہ کے تعین میں جو رول ادا کیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ پربھاکر ماچوے نے ہینکس کا تذکرہ جس طرح کیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی توجہ کا مرکز ہینکس کی شاعری کے بجائے ان کی ظاہری وضع اور طرز اعمال رہا ہے۔ متعدد مضامین میں ۶۰ء کے بعد اپنی ادبی حیثیت کا احساس دلانے والے شاعروں اور ان کی نظموں کے نام دئے گئے ہیں لیکن یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان نظموں سے کن تبدیلیوں یا امتیازات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اردو سے متعلق مضمون عمیق حنفی کا ہے۔ انھوں نے ۶۰ء کے بعد شائع شدہ شعری مجموعوں اور جدید نظمیہ شاعری کے عام رجحانات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ اردو غزل دیگر ہندوستانی زبانوں کی شعری اصناف سے کلیتہً مختلف ہے اور اس نے اپنے خارجی حدود یا ماضی کی مستحکم اور دور رس الاثر روایت کی گرفت کے باوجود نئے احساس و آہنگ کو کس خوبی کے ساتھ اپنایا ہے، عمیق حنفی نے اس جائزے میں غزل کو بھی شامل کر لیا ہوتا تو بہتر تھا۔ سندھی شاعری پر شیام پربھار کا مضمون بہت توجہ کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اپنے موضوع کی ہر شرط پوری کرتا ہے۔

(باقی صفحہ ۱۰ کالم ۲ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید بنا علی نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کی